شاہد حسین رزاقی

لیبیا

دوسری عالمی جنگ کے بعد جو ممالک آزاد ہوئے ہیں ان میں شمالی افریقہ کا ملک لیبیا خاص اہمیت کا حامل ہے۔ بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں نے دنیا کی تاریخ میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور یہ تہذیب و ثقافت کے مرکز اور حکومت و سیاست کی جولان گاہ رہے ہیں صنعتی انقلاب کے بعد یورپی اقوام نے اپنے سامراجی مفاد کی خاطر شمالی افریقہ کے جن ممالک پر قبضہ جما لیا، ان میں لیبیا بھی شامل تھا۔ یہ ملک شمالی افریقہ کے وسط میں مصر اور تونس و الجزائر کے درمیان واقع ہے اور اپنے محلِ وقوع کی بنا پر بحیرۂ روم کی سیاست میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی اہمیت کی وجہ سے عہدِ قدیم کے رومنوں کی طرح جدید اطالیہ کے فاشستوں نے بھی اس کو اپنی ہوسِ ملک گیری کا شکار بنایا اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ظلم و تشدد کی پالیسی اختیار کی۔ لیکن اہلِ لیبیا کا جذبۂ حریت سرد نہیں ہوا۔ وہ مسلسل جد و جہد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دوسری عالمی جنگ میں اٹلی کو شکست ہوئی اور لیبیا آزاد ہو گیا۔

عہدِ قدیم اور اسلامی دور کا آغاز

لیبیا کا رقبہ ۶۸۵۰۰۰ مربع میل ہے اور اتنے وسیع ملک کی آبادی صرف پندرہ لاکھ ہے۔ یہ مملکت تین علاقوں پر مشتمل ہے۔ برقہ، طرابلس اور فزان۔ ان میں برقہ اور طرابلس بڑے اور اہم صوبے ہیں۔ جن کو ایک مملکت میں متحد کرنے کے لیے قوم پرست رہنماؤں کو شدید جد و جہد کرنی پڑی۔ یہ علاقے قدیم زمانہ میں مدتِ دراز تک جداگانہ سیاسی وحدتیں رہے ہیں۔ برقہ پر یونانیوں اور طرابلس پر رومیوں کا قبضہ تھا۔ اور انھوں نے یہاں اپنی نوآبادیاں قائم کر لی تھیں۔ پھر دونوں علاقے رومیوں کے زیرِ اقتدار آ گئے تھے چھٹی صدی عیسوی میں بازنطینی قابض ہو گئے اور پھر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں مصر کے گورنر نے ۶۴۷ء میں ان وسیع علاقوں کو فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں یہاں عرب قبائل بڑی

تعداد میں آباد ہونے لگے اور رفتہ رفتہ عربی اثرات اس قدر بڑھ گئے کہ یہاں کے باشندوں نے عربی زبان اور عربی تہذیب اور تمدن اختیار کر لیا اور یہ وسیع اور اہم علاقے عربی دنیا کا حصہ بن گئے۔

سلطنتِ عثمانیہ میں شمولیت

۱۵۳۱ء میں سلطان سلیمان اعظم کے عہد میں ترکوں نے لیبیا کو فتح کر لیا اور یہ ملک سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہو گیا۔ ۱۷۱۱ء میں ترکی گورنر احمد قرامنلی نے سرکشی کی اور خود مختار حکومت قائم کر لی۔ یہ خاندان ایک صدی سے زیادہ حکمران رہا۔ اس دوران میں یورپی اقوام کی شہنشاہیاں بننے اور بڑھنے لگیں۔ اور ان کی سامراجی مہم سے شمال مغربی افریقہ کے ممالک کو شدید خطرات لاحق ہو گئے جن سے محفوظ رہنے کے لیے سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہونا ضروری خیال کیا جانے لگا۔ چنانچہ لیبیا اور الجیریا کے باشندوں نے سلطان ترکی سے استدعا کی کہ وہ بلادِ مغرب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیں۔ اس طرح ۱۸۳۵ء میں لیبیا پھر سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ بن گیا اور ۱۹۱۲ تک اس پر ترکوں کی براہِ راست حکومت قائم رہی۔ اس کے بعد اطالوی تسلط کا آغاز ہوا جس کے خلاف محبانِ وطن بیس سال تک برسرِ جنگ رہے۔

ترکی اور لیبیا میں اتحاد کی اساس

سلطنتِ عثمانیہ کوئی نسلی یا وطنی مملکت نہ تھی بلکہ اسلامی سلطنت تھی جس کے فرمانروا خلیفۃ المسلمین تھے۔ لیبیا پر بھی عثمانی سلاطین نے خلیفہ کی حیثیت سے حکومت کی اس لیے اہلِ لیبیا اس حکومت کو خود اپنی حکومت اور سلطنتِ عثمانیہ کو اپنی اسلامی سلطنت سمجھتے تھے اور صدقِ دل سے اس کے وفادار رہے۔ انقلابِ فرانس کے بعد وطن پر مبنی تصورِ قومیت کو یورپ میں بہت فروغ ہوا اور بیسویں صدی میں یورپی اقوام نے اپنے استعماری مقاصد کے لیے اس تصور کو اسلامی ممالک میں پھیلانے کی بہت کوشش کی، لیکن انیسویں صدی میں قومیت کا یہ تصور جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھا۔ اسلامی ممالک کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ اور ان کا تصورِ قومیت و حریت مغربی تصورات سے بالکل مختلف تھا۔

انیسویں صدی عیسوی میں سید جمال الدین افغانی نے اسلامی اخوت اور بین الاسلامی اتحاد

کی تحریک کو بہت فروغ دیا تھا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے بہت کشش تھی۔ مصر اس تحریک کا مرکز بن گیا تھا اور بلاد مغرب اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اسلامی دنیا میں بین الاسلامی تحریک کے اثرات اس قدر قوی اور ہمہ گیر تھے کہ نئے حالات کی بنا پر شمالی افریقہ کے ممالک میں جو قومی تحریکیں نمودار ہوئیں وہ بھی اسی کا حصہ بن گئیں۔ ان ممالک کے قوم پرست رہنماؤں کے نزدیک قومیت کا مفہوم یہ تھا کہ ان ممالک کو مغربی سامراج کے تسلط سے محفوظ رکھا جائے اور اس مقصد کے لیے سلطنت عثمانیہ کو زیادہ سے زیادہ مستحکم بنایا جائے۔ چنانچہ اپنے ملک کو عثمانی اقتدار سے آزاد کرانے کی کوشش کے بجائے اس سے مستحکم وابستگی اور وفاداری ان سب ممالک میں قومی تحریک کا بنیادی اصول بن گئی۔ لیبیا بھی آخر وقت تک سلطان و خلیفہ کا وفادار اور اطاعت گزار رہا اور اسلامی رشتہ ترکی اور لیبیا کے درمیان سیاسی اتحاد کا موثر ترین ذریعہ ثابت ہوا۔

سنوسی تحریک

انیسویں صدی یورپی سامراج کے عروج اور اسلامی ممالک کے زوال کا زمانہ ہے۔ اس صدی کے آخر نصف میں مسلمان پستی کی اس انتہا کو پہنچ گئے تھے جہاں پہنچ کر قومیں یا تو پھر ابھرتی ہیں یا فنا ہو جاتی ہیں۔ اس نازک مرحلے پر مسلمانوں کو اپنی زبوں حالی کا احساس ہوا۔ اور بیداری کے آثار پیدا ہونے لگے۔ معاشری اصلاح، سیاسی آزادی، اقتصادی ترقی اور اسلامی نظام حیات کی تجدید کے لیے کئی تحریکیں شروع ہو گئیں جن میں "سنوسی تحریک" بھی شامل ہے۔ یہ شمالی افریقہ کے پُرجوش مسلمانوں کی ایک مجاہدانہ تحریک تھی جو الجیریا میں شروع ہوئی، مراکش اور تونس میں پھیلی، لیبیا میں بہت مقبول ہوئی اور پھر مصر اور سوڈان سے گزر کر حجاز اور یمن تک پھیل گئی۔

شیخ محمد ابن علی السنوسی

اس تحریک کے بانی شیخ محمد ابن علی السنوسی تھے۔ ان کا خاندان علم و فضل میں بہت ممتاز تھا۔ اور زہد و تقویٰ کے علاوہ فنِ سپہ گری میں کمال مہارت کے لیے بھی مشہور تھا۔ محمد ابن علی نے فاس اور قراوین کی یونیورسٹیوں میں اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ اور اس کے بعد حدیث و فقہ کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کئی سال قیام کیا۔ شیخ محمد کا اولین مقصد یہ تھا کہ لوگوں کی مذہبی حالت بہتر بنائی جائے اور اس کے لیے انھوں نے تونس، طرابلس، قاہرہ اور

مکّہ معظمہ میں جدوجہد کی۔ اور مذہبی مصلح کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ اُن کے عقیدت مندوں کا ایک حلقہ بن گیا اور رفتہ رفتہ ان اصولوں کی تشکیل ہونے لگی جن پر آگے چل کر ایک روحانی اور سیاسی تحریک قایم کی گئی۔ محمد بن علی کی یہ تحریک جو "السنوسیہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ ایک طرف تو مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں اصلاح کرنے لگی۔ اور دوسری طرف مغربی اقوام کے تسلّط کو ختم کرنے کے لیے مصروف جہاد ہو گئی۔ سنوسی تحریک لیبیا میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کے سربراہ نہ صرف روحانی بلکہ سیاسی رہنما بھی بن گئے اور لیبیا کی تحریکِ آزادی نے طویل جدوجہد اور کامیابی کی منزلیں اُن کی قیادت میں طے کیں۔

تحریک کے بنیادی مقاصد

سنوسی تحریک کے بنیادی مقاصد یہ تھے کہ مسلمانوں کی مذہبی حالت درست کی جائے، تاکہ وہ غیر اسلامی عقاید و اعمال کو ترک کر کے حقیقی اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اُن کو دُور کر کے اسلامی معاشرہ قایم کیا جائے۔ اور تعلیم و تربیت سے مسلمانوں میں وہ اوصاف پیدا کیے جائیں جن کی وجہ سے اسلام نے قرونِ اولیٰ میں اس قدر ترقی کی تھی۔ مسلمانوں کی مطلق العنان حکومتوں کو جو غیر اسلامی ہیں ختم کر دیا جائے اور خلافتِ راشدہ کو نمونہ بنا کر خالص اسلامی طرز کی حکومتیں قایم کی جائیں۔ اور مغربی اقوام کے تسلّط کو ختم کرنے کے لیے عملی جدوجہد کی جائے اور ان کے خلاف جہاد کو ایک ملّی اور مذہبی فرض قرار دے کر مسلمانوں میں فنونِ سپہ گری کی تربیت کو عام کیا جائے۔

مراکز اور تنظیم

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے تحریک کے مراکز قایم کیے گئے جو زاویہ کہلاتے تھے۔ یہ زاویے شہروں سے دُور عرب اور افریقہ کے نخلستانوں میں تھے یا ایسے مقامات میں قایم کیے گئے جو ریگستانوں میں اہم تجارتی راستوں پر واقع تھے۔ تاکہ وہ بیرونی مداخلت سے دُور رہ کر اپنا کام جاری رکھ سکیں۔ سنوسیوں نے اپنے زاویوں میں قرآن پر مبنی قانون نافذ کیا۔ تحریک کا امام سنوسی نظامِ حکومت کا بھی صدر تھا اور اس کو امیر کہتے تھے۔ مختلف زاویوں یا مرکزوں میں امیر کے نمائندے ہوتے تھے جو وکیل کہلاتے تھے۔ وکیل زاویہ کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ تحریک کے

مرکز قلعہ نما اور مستحکم بنائے جاتے تھے اور یہ عموماً چشموں اور نہروں کے کنارے ہوتے۔ یہاں باغ، کنوئیں اور سرائیں تعمیر کی جاتیں۔ مرکز سے متصل کھیت ہوتے تھے جن کی پیداوار میں بیت المال اور کاشت کار کا حصہ تھا۔ زراعت کو ترقی دینے اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ تحریک کے مقاصد کی اشاعت کے لیے ہر مرکز میں خانقاہ ہوتی تھی جو عیسائی خانقاہوں سے بالکل مختلف تھی۔ کیونکہ یہاں رہبانیت کے بجائے جہاد کی تعلیم دی جاتی تھی۔ سنوسی خانقاہیں تمدنی، سیاسی، اقتصادی اور مذہبی تعلیم و تربیت کا مرکز تھیں۔ خانقاہوں سے متصل مسجدیں اور مدرسے بنائے گئے تھے۔ ابتدائی تعلیم لازمی کر دی گئی تھی اور آگے چل کر فنونِ حرب کی تعلیم بھی لازمی ہو گئی۔ شمال مغربی اور وسطی افریقہ میں زاویے بکثرت بنائے گئے تھے۔ ان میں سے زاویۂ جغبوب تحریک کے امیر کا مستقر تھا۔ اور دوسرے اہم زاویے سبواہ، کفرہ جالو اور اوجلا تھے جہاں سے تحریک کی رہنمائی کی جاتی تھی۔

محمد مہدی السنوسی

محمد بن علی کے بعد ان کے بیٹے محمد مہدی السنوسی ان کے جانشین ہوئے۔ اس زمانے میں فرانس اپنے مقبوضات پر بہت ظلم کر رہا تھا۔ اس کے خلاف جہاد کرنے کے لیے شیخ مہدی نے تحریک کی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا اور مجاہدوں کی تربیت یافتہ جماعتیں تیار کیں اور اپنا مرکز سوڈان کی سرحد کے قریب بمقام کفرہ منتقل کر دیا۔ شیخ مہدی کے زمانہ میں تحریک کو بہت فروغ ہوا اور اس کے اثرات مراکش سے لے کر ہندوستان تک پھیل گئے، فرانس پہلے ہی سنوسیوں سے خوفزدہ تھا اور جب ان کا اقتدار صحرا تک بڑھ گیا تو اس نے حملہ کر دیا۔ سنوسی مجاہدوں نے چودہ سال تک فرانس کی فوجوں سے جنگ کی اور بہت کامیابی سے مقابلہ کرتے رہے۔

احمد شریف السنوسی

شیخ مہدی کے جانشین شیخ احمد شریف السنوسی ہوئے اور انھوں نے تحریک کی اشاعت و تنظیم اور مجاہدانہ سرگرمیوں پر پوری توجہ کی۔ شیخ احمد استنبول میں سید جمال الدین افغانی سے ملے تھے اور ان سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی قیادت میں سنوسی تحریک پر اتحادِ اسلامی کا رنگ بہت غالب آ گیا اور وہ ترکوں کی زبردست حمایت کرنے لگے، چنانچہ کئی جنگوں میں سنوسی ترکوں

بہترین مددگار ثابت ہوئے۔ اور شیخ احمد نے مسلمانوں کے ایک محبوب رہنما کا مرتبہ حاصل کرلیا۔

ادریس السنوسی

شیخ احمد کے جانشین شیخ ادریس ہوئے جن کو اٹلی نے برقہ کا امیر تسلیم کرلیا تھا، مگر لیبیا میں آزادی کی جنگ جاری رہی۔ امیر ادریس بائیس سال تک جلاوطن رہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جب اٹلی کو شکست ہوئی اور لیبیا پر اُس کا اقتدار ختم ہوگیا تو شیخ ادریس وطن واپس آئے اور سنوسی تحریک کو پھر منظم کرکے حریت پسندوں کی رہنمائی کرنے لگے۔ یکم جنوری ۱۹۵۲ء کو لیبیا کی آزاد مملکت قایم کی گئی تو شیخ ادریس اس نئی مملکت کے بادشاہ ہوگئے۔ اس طرح سنوسی امامت لیبیا کی بادشاہت میں تبدیل ہوگئی۔ اور وہ زبردست تحریک کمزور ہوتی گئی جس نے لیبیا کی تاریخ میں ولولہ انگیز اور انقلاب آفرین باب کا اضافہ کیا تھا۔

جنگِ طرابلس

یورپ کی سامراجی قومیں اپنے سامراجی مفاد کی حفاظت کے لیے بحیرہ روم کو اپنے زیر اثر رکھنا ضروری خیال کرتی تھیں۔ اور اس کے لیے انھوں نے شمالی افریقہ کے ملکوں پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنائے۔ چنانچہ مراکش، الجیریا اور تونس پر فرانس نے اور مصر پر برطانیہ نے اپنا اقتدار قایم کرلیا اور اٹلی نے لیبیا پر قبضہ کرنے کے لیے ۲۹ ستمبر ۱۹۱۱ء کو ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا اور جنگِ طرابلس شروع ہوگئی۔ لیبیا مرکز سے بہت دُور تھا۔ یہاں تھوڑی سی فوج تھی اور نقل و حمل کے ذرائع محدود تھے۔ مصر انگریزوں کے زیر اثر تھا جو اٹلی کے حامی تھے اور ترکوں کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کر رہے تھے۔ ان سب مشکلات کے باوجود حملہ آوروں سے شدید جنگ کی گئی۔ ترکی حکومت نے انور پاشا اور مصطفےٰ کمال جیسے قابل فوجی افسر لیبیا بھیج دیے تھے جن کی قیادت میں اہلِ لیبیا نے بہت ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ لیکن سامراجیوں کے منصوبے لیبیا ہی تک محدود نہ تھے۔ بلقان میں بڑے نازک حالات پیدا ہوگئے تھے اور بین الاقوامی دباؤ اور بگڑے ہوئے حالات سے مجبور ہوکر اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ترکوں نے اٹلی سے صلح کرلی۔

صلح کرنے سے قبل بابِ عالی نے برقہ اور طرابلس کو خود اختیاری دے دی تھی۔ لیبیا کے

بعض رہنماؤں کا یہ خیال تھا کہ اس خود اختیاری کو اساس بنا کر آزادی کے لیے اٹلی سے گفت و شنید کی جائے لیکن حقیقت پسند رہنما اس سے بخوبی واقف تھے کہ اٹلی گفت و شنید کے ذریعہ آزادی تسلیم نہیں کرے گا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ جنگ جاری رہے اور اٹلی کو شکست دے کر آزادی حاصل کی جائے۔ سنوسی امیر سید احمد شریف نے جو ترکوں کے بڑے حامی تھے اور جنگِ طرابلس میں نمایاں کارنامے انجام دے کر بہت مشہور ہو گئے تھے، جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھے اور انھوں نے اٹلی کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر دی۔ جنگ جو قبائل ان کے گرد جمع ہو گئے تھے اور انھوں نے تربیت یافتہ چھاپہ مار دستے تیار کیے تھے۔ جو اچانک حملے کر کے اطالوی فوج کو شدید نقصان پہنچاتے تھے۔

طرابلس پر اٹلی کا قبضہ

احمد شریف نے اٹلی کی فوجوں کو باقاعدہ جنگ میں بھی شکست دی جن میں عزیز المصری کی جنگی قابلیت سے بہت مدد ملی۔ لیکن فیصلہ کن جنگ سے پہلے ہی احمد شریف اور عزیز المصری میں جنگی منصوبے پر اختلاف ہو گیا اور عزیز المصری اپنا توپخانہ لے کر قاہرہ چلے گئے۔ اس اختلاف سے بہت نقصان پہنچا اور احمد شریف کی فوجی طاقت کمزور پڑ گئی۔ اٹلی سے جنگ کرنے کی حامی جماعت کے ایک رہنما سلیمان الباروني تھے جو بہت جری اور جنگ جو تھے لیکن باہمی اختلاف کی وجہ سے وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے اور چند مہینے کی جنگ کے بعد طرابلس پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا۔

اٹلی کی حکومت محض طاقت کے بل پر قایم تھی۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑی تو لیبیا کے حریت پسند پھر سرگرم عمل ہو گئے۔ فزان میں قبیلوں نے بغاوت کر دی۔ طرابلس میں رمضان السواحلی نے اطالوی فوجوں پر حملہ کر کے ان کو زبردست شکست دی اور برقہ میں احمد شریف کے بھائی صفی الدین اپنی فوج لے کر اٹلی کے مقابلہ پر آ گئے۔ اٹلی کے لیے حالات بہت نازک ہو گئے تھے اور اگر لیبیا کے تینوں علاقے سنوسی امیر احمد شریف کے پرچم تلے متحد ہو کر مقابلہ کرتے تو اٹلی کا اقتدار ختم ہو جاتا۔ لیکن اس موقع پر بھی اتحاد نہ ہو سکا اور طرابلس اور برقہ کی سیاسی رقابت نے بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔ طرابلسی رہنما برقہ کے امیر کا اقتدار تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور یہ اختلاف اتنا بڑھ گیا کہ سواحلی اور صفی الدین کی فوجوں میں جنگ ہو گئی۔ صفی الدین کو شکست ہوئی اور اس کی

فوجیں برقہ واپس ہوگئیں۔

انگریزوں سے جنگ اور راضی نامۂ طبروق

جرمنی کے خلاف جنگ میں اٹلی کی شرکت کی وجہ سے لیبیا کے حالات پر گہرا اثر پڑا۔ احمد شریف ترکوں کے زبردست حامی تھے۔ اور جب برطانیہ اٹلی کی حمایت کرنے لگا تو انھوں نے انگریزوں سے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۱۵ء میں سنوسی فوج مصر میں داخل ہوگئی لیکن جنوری ۱۹۱۶ء میں سنوسیوں کو شکست ہوئی اور وہ مصر سے واپس آگئے۔ سید احمد شریف نے سید ادریس کو برقہ کا امیر بنادیا اور خود استنبول چلے گئے۔ چونکہ ادریس اس جنگ کے خلاف تھے اس لیے انگریز اُن سے مفاہمت کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ اسی دوران میں آسٹریا نے اٹلی کو شکست دی۔ اور وہ بھی لیبیا میں اپنی جارحانہ روش تبدیل کرکے سید ادریس سے مصالحت پر تیار ہوگیا۔ چنانچہ برطانیہ و اٹلی اور سید ادریس کے درمیان طبروق میں مذاکرات ہوتے اور ایک راضی نامہ طے پایا جس کے مطابق برقہ پر سنوسی امیر کا اقتدار تسلیم کرلیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں برقہ اور طرابلس کے لیے الگ الگ دستور بنائے گئے اور دونوں علاقوں کی جداگانہ پارلیمنٹ اور مرکزی و مشاورتی کونسلیں قایم کی گئیں۔

اہلِ برقہ اس راضی نامہ سے مطمئن نہ تھے اور اٹلی میں ایک طبقہ کا یہ خیال تھا کہ لیبیا کو فوجی طاقت سے محکوم بنانے کے بجائے مصالحت کی پالیسی اختیار کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اٹلی کی سوشلسٹ حکومت نے اہلِ برقہ کو مطمئن کرنے کے لیے اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ایک اور راضی نامہ کیا جس کے مطابق ادریس کو برقہ کے خود مختار علاقہ کا امیر تسلیم کرلیا گیا جس میں جغبوب، اوجیلہ، جالو اور کفرہ کے نخلستان شامل تھے۔ اور اجدابیہ امیر کا مستقر قرار پایا۔ ۱۹۲۱ء میں برقہ کی پارلیمنٹ قایم کی گئی جس کے ساٹھ ممبر تھے اور صدر صفی الدین سنوسی تھے۔ مسولینی برسرِ اقتدار آیا تو اس نے جبر و تشدد کی پالیسی اختیار کی۔ راضی نامے منسوخ کردیے اور پارلیمنٹ توڑ دی گئی۔

جمہوریۂ طرابلس کا قیام

البارونی کی شکست کے بعد اٹلی نے طرابلس پر براہ راست قبضہ کرلیا تھا۔ مگر جنگِ عظیم کے دوران اس کا اقتدار ختم ہوگیا اور اس کی حکومت صرف شہر طرابلس تک محدود ہوگئی۔ ۱۹۱۵ء میں ترکی سلطان

نے سلیمان الباروفی کو طرابلس کا گورنر مقرر کیا اور وہ اٹلی سے جنگ کرنے لگے۔ جنگ کے اختتام پر باروفی اور سوا علی نے طرابلس کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں قومی کنونشن طلب کیا گیا، جس نے طرابلس کو جمہوریہ قرار دیا اور چار رکنی پریشنل صدریہ بنایا گیا۔ اٹلی نے طرابلس کی آزادی تسلیم کرنے سے انکار کیا، تاہم گفت و شنید پر آمادگی ظاہر کی۔ حالات سے مجبور ہو کر اٹلی مصالحت کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے طرابلس کی نئی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ جون ۱۹۱۹ء میں طرابلس کا دستور بنایا گیا اور پارلیمنٹ قائم کی گئی۔ اس وقت اٹلی کی پالیسی یہ تھی کہ برقہ اور طرابلس میں ایسی خود مختار حکومتیں بنائی جائیں جن پر اٹلی کی بالادستی قائم رہے لیکن مقامی رہنما مکمل آزادی کے طلب گار تھے۔ اٹلی کی طاقت اس قدر ٹوٹ گئی تھی کہ اگر لیبیا کے رہنما متحد ہو کر جدوجہد کرتے تو اپنا مقصد حاصل کر لیتے۔ مگر وہ متحد نہ ہو سکے اور ناکام رہے۔ اٹلی چونکہ ان کی اس کمزوری سے واقف تھا اس لیے آزادی کا مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا رہا۔

غریان کانفرنس کا فیصلہ

نومبر ۱۹۲۱ء میں طرابلسی رہنماؤں کی کانفرنس غریان میں ہوئی جس میں یہ طے کیا گیا کہ برقہ کے امیر سید ادریس کو طرابلس کا بھی امیر بنا دیا جائے۔ اٹلی نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کیا اور جنگ شروع ہو گئی طرابلس کے رہنماؤں نے ایک وفد امیر ادریس کے پاس بھیجا اور ان کو امیر بننے کی دعوت دی۔ برقہ کے رہنما بھی یہ چاہتے تھے کہ امیر ادریس یہ دعوت قبول کر لیں اور دونوں صوبے ایک امیر کے تحت متحد ہو جائیں۔ اتحاد کی یہ تحریک تیزی سے پھیل رہی تھی اور امیر ادریس نے اہل طرابلس کی یہ دعوت قبول کر لی۔ اٹلی نے تشدد کی پالیسی اختیار کی اور اس کے مظالم کی وجہ سے بڑے نازک حالات پیدا ہو گئے۔ آخر کار دسمبر ۱۹۲۲ء میں امیر ادریس قاہرہ چلے گئے اور تحریک آزادی کے کئی رہنما جلاوطن ہو گئے۔

عمر المختار اور جنگ آزادی

برقہ اور طرابلس میں آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے اٹلی نے ظلم و تشدد کی پالیسی اختیار کی اور نئی تربیت یافتہ اور خوب مسلح فوج لیبیا بھیجی گئی جس نے شہروں پر اپنی گرفت کو مضبوط کر کے ان قبائلی علاقوں سے رابطہ توڑ دیا جہاں آزادی کی جدوجہد زوروں پر تھی۔ جبل اخضر کے پہاڑی علاقے تحریک آزادی کے مرکز تھے۔ یہاں جنگجو قبائل آباد تھے جو سنوسی امیر کے جھنڈے تلے اور وفادار

تھے۔ عمر المختار تحریکِ آزادی کے ایک ممتاز رہنما تھے۔ ۱۹۱۱ء کی جنگِ طرابلس میں وہ سید احمد شریف کی سرکردگی میں اطالوی فوجوں سے لڑے تھے اور بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ ۱۹۲۲ء میں امیر ادریس کے ساتھ عمر مختار بھی قاہرہ چلے گئے تھے مگر چند ماہ بعد ہی وہ لیبیا واپس آئے اور اٹلی کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ عمر مختار نے قبائلی سرداروں کی حمایت حاصل کی۔ امیر ادریس کی سابق فوج کے سپاہیوں کو منظم کیا۔ جنگ جو قبائلیوں کو گوریلا جنگ کرنے کی اعلیٰ تربیت دی اور اٹلی کی کثیر فوجوں کے خلاف دس سال تک لڑتے رہے۔ عمر مختار اطالوی فوج پر بڑے زور شور سے اچانک حملہ کرتے تھے اور یہ حملے اتنے شدید اور برق آسا ہوتے تھے کہ اطالویوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملتا، اور ان کو شدید نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ ان حملوں کی وجہ سے اطالوی فوج مفلوج ہو گئی تھی۔ رات کو اطالوی اپنی پناہ گاہوں میں چھپ جاتے تھے اور ہر طرف عمر مختار کی حکومت ہوتی تھی۔

عمر مختار کے جنگی کارناموں کی بڑی شہرت ہوئی۔ اطالوی ان کے نام سے لرزنے لگے۔ اہلِ لیبیا ان کو اپنا قومی ہیرو سمجھنے لگے۔ نوجوان ان کے گرویدہ ہو گئے۔ عمر مختار نے جب یہ جنگ شروع کی تو ان کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی اور وہ دس سال تک مسلسل جنگ کرتے رہے۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں عمر مختار ایک لڑائی میں زخمی ہو گئے۔ اطالویوں نے ان کو قید کر لیا اور چند روز کے بعد پھانسی دے دی۔ عمر مختار کے بعد تحریکِ مقاومت کمزور پڑ گئی لیکن وہ جنگِ آزادی کی علامت بن گئے تھے۔ محبانِ وطن کے لیے وہ ایک فیض آفرین نمونہ تھے اور دوسری عالمی جنگ کے بعد لیبیا کی آزادی کے لیے جو تنظیم قایم کی گئی اس کا نام "عمر المختار" رکھا گیا جس نے حصولِ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اسکندریہ کانفرنس کے فیصلے

لیبیا کے رہنما اٹلی سے سمجھوتہ کر لینے کے خلاف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اتنی بڑی مسلح فوجوں سے جنگ کرنا دشوار ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ لیبیا اسی وقت آزادی حاصل کر سکتا ہے جب اٹلی کسی بڑی جنگ میں الجھ جائے اور شکست کھائے۔ ان کا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ دوسری عالمی جنگ میں اٹلی کو شکست ہوئی تو لیبیا کی آزادی کا راستہ ہموار ہو گیا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو لیبیا کے رہنماؤں نے یہ طے کیا کہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اور طرابلس و برقہ کے اختلافات کو ختم کر کے متحدہ محاذ بنایا جائے، چنانچہ

اکتوبر ۱۹۳۹ء میں اسکندریہ میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں امیر ادریس کو تحریک آزادی کا قائد منتخب کیا گیا اور یہ طے پایا کہ امیر ادریس برقہ اور طرابلس کے ممتاز رہنماؤں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائیں جس کے مشورہ سے آزادی کی تحریک چلائی جائے۔

عالمی جنگ میں برطانیہ کی امداد

امیر ادریس نے مصر میں برطانوی حکام سے بھی رابطہ قایم کیا اور ان سے گفت و شنید کے بعد اگست ۱۹۴۰ء میں لیبیا کے رہنماؤں کی ایک کانفرنس قاہرہ میں طلب کی جس نے امیر ادریس اور حکومتِ برطانیہ پر اظہارِ اعتماد کرتے ہوئے امیر کو یہ اختیار دیا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد لیبیا کو آزادی دینے کے لیے وہ حکومتِ برطانیہ سے گفتگو کریں۔ اس کانفرنس نے امیر ادریس کی سرکردگی میں اٹلی کے خلاف برطانیہ کی امداد، نظم و نسق کے قیام اور تحریکِ آزادی کے فروغ کے لیے چند تجاویز منظور کیں جن سے تونس، مصر، سوڈان اور شام میں مقیم مہاجرین نے بھی اتفاق کیا۔ کانفرنس کی یہ تجاویز لیبیا اور برطانیہ کے درمیان تعاون کی بھی اساس بنیں۔ اٹلی کے خلاف برطانیہ کی امداد کے لیے سنوسی فوج منظم و مسلح کی گئی اور جبل اخضر کے جنگ جو قبائل پر مشتمل گوریلا جنگ کرنے والے دستے تیار کیے گئے۔

امیر ادریس کے مطالبات

قاہرہ کانفرنس کے بعد امیر ادریس نے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ لیبیا کو داخلی آزادی دی جائے۔ اور ایک مسلمان امیر کے تحت پورے لیبیا کی حکومت قائم کی جائے۔ برطانیہ نے یہ وعدہ کیا کہ جیسی حکومت شرقِ اردن میں قایم ہے ویسی ہی لیبیا میں بھی قائم کر دی جائے گی لیکن لیبیا کے مستقبل کے بارے میں کوئی قطعی یقین دہانی نہیں کی۔ اس سے طرابلس کے رہنما مطمئن نہیں ہوئے اور یہ مطالبہ کیا کہ برطانیہ یہ پختہ وعدہ کرے کہ لیبیا کو آزادی دی جائے گی۔ برقہ کے رہنماؤں نے بھی اس مطالبہ کی حمایت کی۔ مگر انگریز جنگ ختم ہونے سے قبل کوئی قطعی وعدہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس طرزِ عمل سے لیبیا کے رہنما بہت مایوس ہوئے اور انتہا پسند عناصر برطانیہ کی امداد کرنے پر امیر ادریس کو موردِ الزام قرار دینے لگے۔ لیکن امیر کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اہلِ لیبیا اگر انگریزوں کی امداد کرتے رہے تو اس کے صلہ میں جنگ کے اختتام پر وہ آزادی طلب کر سکیں گے۔ ورنہ پھر

کس بنیاد پر وہ انگریزوں سے مطالبہ کر سکیں گے کہ ان کو اٹلی کے پنجے سے نجات دلا کر آزادی دی جائے۔

انگریزوں کا قبضہ اور فوجی حکومت

جون ۱۹۴۰ء میں مسولینی نے برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ انگریزوں نے نومبر ۱۹۴۲ء میں برقہ پر اور دسمبر ۱۹۴۲ء میں طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ اور جنوری ۱۹۴۳ء میں فزان پر آزاد فرانس کی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ برقہ اور طرابلس میں فوجی حکومتیں قائم کی گئیں اور فزان میں ریذیڈنٹ کے زیرِ اقتدار مقامی حکومت قائم ہوئی۔ اطالوی تسلط ختم ہوتے ہی لیبیا میں سیاسی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ سیاسی پارٹیاں قائم کرنے کا مطالبہ ہونے لگا۔ جو لوگ جلاوطن ہو گئے تھے وہ وطن واپس آئے۔ ان میں سیاسی شعور زیادہ تھا اور انھوں نے سیاسی پارٹیاں بنانے، اہلِ ملک کو حکومت میں شریک کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر مہم شروع کر دی۔

مجلس عمر المختار کی سرگرمیاں

لیبیا میں ایسے نوجوان محبانِ وطن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا جو تمام مسائل پر قومی نقطۂ نظر سے غور کرتے تھے اور برقہ اور طرابلس کے صوبائی اور علاقائی مفاد کے بجائے لیبیا کے اتحاد اور قومی مفاد و مقاصد کی حمایت کرتے تھے۔ اسد بن عمران نامی ایک نوجوان نے ان لوگوں کو منظم کرنے اور قومی اتحاد اور آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے اپنے نامور رہنما عمر المختار کے نام پر ایک جماعت "عمر المختار" قائم کی۔ یہ جماعت ایک علمی مجلس کی حیثیت سے اپریل ۱۹۴۳ء میں بن غازی میں قائم ہوئی تھی۔ قومی اتحاد اور آزادی کو اس نے اپنا نصب العین بنایا تھا اور اس کی اشاعت کے لیے ایک ماہنامہ "مجلۃ عمر المختار" اور ایک اخبار "الوطن" جاری کیا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں یہ جماعت علانیہ ایک سیاسی جماعت بن گئی۔ اس کی قیادت پُرجوش نوجوانوں کے ہاتھ میں آ گئی اور آزادی کی جدوجہد میں اس نے نمایاں حصہ لیا۔

طرابلسی رہنماؤں کے مطالبات

اٹلی کے پنجہ سے نجات ملتے ہی جنوری ۱۹۴۳ء میں طرابلس کے ممتاز رہنماؤں کی کانفرنس ہوئی جس میں برطانوی افسروں سے مطالبہ کیا گیا کہ سیاسی پارٹیاں قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ کانفرنس نے یہ بھی واضح کیا کہ برقہ اور طرابلس ایک ہی ملک کے دو حصے ہیں۔ ان دونوں کے

بارے میں یکساں پالیسی اختیار کی جائے۔ اور برقہ کی طرح طرابلس کو بھی یہ یقین دلایا جائے کہ اس کو پھر اٹلی کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔

سیاسی جماعتوں کا قیام

طرابلس میں "حزب الوطنی" کے نام سے ایک خفیہ جماعت ۱۹۴۴ء میں قایم کی گئی جس کے قائد احمد الفقیہ تھے۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں فوجی حکومت نے اس تنظیم کو تسلیم کر لیا اور یہ علانیہ کام کرنے لگی۔ اس کے بعد نیشنل بلاک، یونین پارٹی اور لبرل پارٹی کئی جماعتیں قایم ہو گئیں۔ امیر ادریس کو متحدہ لیبیا کا امیر بنانے سے کچھ رہنماؤں کو اختلاف تھا۔ لیکن تین مقاصد پر طرابلس کی تمام جماعتیں متفق تھیں۔ یعنی مکمل آزادی، برقہ، طرابلس اور فزان تینوں صوبوں پر مشتمل متحدہ مملکتِ لیبیا کا قیام اور عرب لیگ میں لیبیا کی شمولیت۔

قومی اتحاد کے لیے جدوجہد

طرابلسی رہنماؤں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ لیبیا کو اس وقت تک متحد نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ امیر ادریس کو پورے لیبیا کا امیر تسلیم نہ کر لیا جائے اور قومی اتحاد کے بغیر آزادی حاصل کرنا بہت دشوار ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے امیر ادریس کی بیعت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کے لیے متحدہ قومی محاذ قایم کیا گیا اور جون ۱۹۴۶ء میں محاذ کے رہنماؤں نے قومی اتحاد کے لیے امیر ادریس کے سامنے یہ تجاویز پیش کیں کہ اگر بڑی طاقتوں کی طرف سے آزادی یا تولیت کی کوئی ایسی تجویز پیش کی جائے جو دونوں صوبوں میں سے کسی ایک کے مفاد کے خلاف ہو تو وہ مسترد کر دی جائے۔ امیر ادریس متحدہ لیبیا کے امیر بنائے جائیں لیکن یہ امارت موروثی نہ ہو۔ اور لیبیا کا نظام حکومت دستوری اور پارلیمنٹری ہو۔ امیر نے قومی اتحاد اور آزادی کے لیے پوری جدوجہد کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد برقہ اور طرابلس کے وفود میں مذاکرات ہوئے اور یہ طے کیا گیا کہ لیبیا کے تمام علاقوں کو متحد کر کے ایک مملکت بنائی جائے جس کو مکمل آزادی حاصل ہو۔ امیر ادریس کو لیبیا کا امیر بنا کے دستوری اور پارلیمنٹری حکومت قایم کی جائے اور آزادی ملنے کے بعد لیبیا عرب لیگ کا رکن بن جائے۔

اطالوی نوآبادیوں کا مسئلہ: ۱۰ فروری ۱۹۴۷ء کو اٹلی سے صلح نامہ ہوا لیکن لیبیا کا مسئلہ

حل نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اطالوی نوآبادیوں کے بارے میں فیصلہ اٹلی سے صلح کرنے والی چار بڑی طاقتیں کریں گی۔ اور ان ملکوں نے یہ مسئلہ وزرائے خارجہ کی کونسل کے تفویض کر دیا۔ کونسل اصولی طور پر اس سے متفق تھی کہ یہ نوآبادیاں اقوام متحدہ کی تولیت میں دی جائیں۔ لیکن ان کا انتظام کس طرح کیا جائے اس پر شدید اختلاف تھا۔ لیبیا کے متعلق امریکہ کی تجویز یہ تھی کہ اس پر اقوام متحدہ کی اجتماعی تولیت قایم کی جائے اور دس سال کے بعد آزادی دی جائے۔ روس چاہتا تھا کہ طرابلس دس سال کے لیے اس کی تولیت میں دے دیا جائے۔ امریکی تجویز کی برطانیہ نے حمایت اور فرانس نے مخالفت کی۔ اور برطانیہ و فرانس دونوں روسی تجویز کے مخالف تھے، ان اختلافات نے لیبیا کے مسئلہ کو اور الجھا دیا اور اس کو حل کرنے کے لیے برطانیہ نے یہ تجویز کیا کہ لیبیا کو فوراً آزادی دے دی جائے۔ مصر نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر لیبیا کو فوراً آزادی نہ دی گئی تو اس کو مصر یا عرب لیگ کی تولیت میں دیا جائے۔

اطالوی نوآبادیوں کے متعلق تصفیہ کرنے کے سلسلہ میں وزرائے خارجہ کی کونسل نے یہ طے کیا کہ ان نوآبادیوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے ایک کمیشن بھیجا جائے اور وہ نوآبادیوں کا دورہ کر کے اپنی رپورٹ کونسل کے فیصلے کے لیے پیش کرے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں یہ کمیشن لیبیا آیا اور برقہ، طرابلس اور فزان کے حالات کا غائر مطالعہ اور وسیع دورہ کر کے ضروری معلومات فراہم کیں اور اپنی سفارشات کونسل کے سامنے پیش کر دیں، جن پر غور کرنے کے لیے ستمبر ۱۹۴۸ء میں وزرائے خارجہ کا اجلاس پیرس میں ہوا لیکن ان میں اتفاق نہ ہو سکا۔ اور یہ طے ہوا کہ صلح نامہ کی شرائط کے مطابق یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش کر دیا جائے۔

بیون اور اسفورزا کا منصوبہ

ستمبر ۱۹۴۸ء میں جنرل اسمبلی کا اجلاس جب پیرس میں ہوا تو لیبیا کا مسئلہ پیش کیا گیا مگر یہاں بھی بڑی طاقتوں کی باہمی کشمکش کا مظاہرہ ہونے لگا۔ آخر کار برطانیہ اور اٹلی کے وزرائے خارجہ کا تیار کیا ہوا منصوبہ بیون اسفورزا پلان پیش کیا گیا۔ جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ لیبیا کو دس سال کے بعد آزادی دی جائے۔ بشرطیکہ اقوام متحدہ اس کو موزوں تصور کرے اور آزادی سے قبل عبوری دور میں برقہ پر برطانیہ اور طرابلس پر اٹلی کی تولیت قایم کی جائے۔ اس تجویز سے

فرانس بھی متفق تھا۔ لیکن پاکستان اور مصر نے شدید مخالفت کی۔ طرابلس میں اس کے خلاف زبردست ہیجان پیدا ہوگیا تھا اور اس کو ناکام بنانے کے لیے تمام سیاسی جماعتوں نے متحد ہوکر قومی کانگرس قایم کرلی تھی۔ جنرل اسمبلی میں اس کی اتنی مخالفت ہوئی کہ یہ منصوبہ آخرکار مسترد کردیا گیا۔ اور یہ کوشش ہونے لگی کہ ایسی تجاویز پیش کی جائیں جن پر اتفاق رائے ہو۔

(باقی آئندہ)

مسلمانوں کے عقائد و افکار

مقالاتِ اسلامیین

(حصہ اوّل)

علامہ ابوالحسن اشعری ———— ترجمہ: مولانا محمد حنیف ندوی

علامہ ابوالحسن اشعری چوتھی صدی ہجری کی وہ جلیل القدر شخصیت ہیں جنھوں نے مسلسل چالیس برس تک اعتزال و جہمیت کی فتنہ سامانیوں کا شکار رہنے کے باوجود اپنے لیے فکر و تعمق اور اجتہاد و کلام کا ایک علیحدہ اور منفرد دبستان سجایا۔

"مقالاتِ اسلامیین" ان کا وہ علمی شاہکار ہے جسے افکار و نظریات کا انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیے۔ اس میں علامہ نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے اُن تمام عقائد اور افکار کو بغیر کسی تعصب کے بیان کردیا ہے جو صدیوں ہمارے ہاں کے فکری و کلامی مناظروں کا محور بنے رہے۔ اس کے مطالعہ سے جہاں یہ معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے نفسیات، اخلاق اور مادہ روح کے بارے میں کن کن جواہر پاروں کی تخلیق کی ہے۔ وہاں یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا ہے اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کس معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو قائم اور برقرار رکھا ہے۔ یہ کتاب کے پہلے حصے کا اُردو ترجمہ ہے۔

صفحات : ۳۸۰ ۔ قیمت : ۹/ روپے

ملنے کا پتہ:- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ، لاہور